

فرانس میں گستاخانہ خاکوں کی اشاعت

فرانس میں شائع ہونے والے گستاخانہ خاکوں اور متعلقہ اخبار کے دفتر پر حملہ کے نتیجے میں ہونے والی ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ ہلاکتوں پر رد عمل کا سلسلہ دنیا بھر میں جاری ہے۔ گزشتہ دنوں پیرس میں لاکھوں افراد کی ریلی کے ساتھ مختلف ممالک کے سربراہوں نے بھی شریک ہو کر اس سلسلہ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، جبکہ پاکستان کے دینی حلقوں اور عوام کی طرف سے قتل کی مذمت کے ساتھ ساتھ گستاخانہ خاکوں کی اشاعت پر شدید غم و غصہ ایک بار پھر سامنے آ رہا ہے۔

دراصل اس حوالہ سے دو بلکہ تین الگ الگ مسئلے آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں اور عالمی سطح پر مختلف لایاں اپنے اپنے مقاصد کے لیے اس حوالہ سے سرگرم عمل ہیں جس سے یہ معاملہ بظاہر پیچیدگی اور کنفیوژن کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی کی توہین اور اس کے مذہبی جذبات کی تحقیر، بالخصوص حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں گستاخی بھی اظہار رائے کے حق کا حصہ ہے؟ دوسرا یہ کہ کیا یہ جرم اس قدر سنگین ہے کہ اس پر موت کی سزا نافذ کی جائے؟ اور تیسرا یہ کہ اگر ایسے مجرم کو موت کی سزا ہی دی جائے گی تو اس سزا کا نفاذ کون کرے گا اور اس کی اتھارٹی کس کو حاصل ہے؟

جہاں تک پہلے مسئلہ کی بات ہے، اس پر پوری دنیا میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ توہین و تحقیر کارائے کی آزادی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ کم و بیش ہر ملک میں شہریوں کو یہ حق قانوناً حاصل ہے کہ وہ ہتک عزت اور اذالہ حیثیت عرفی کی صورت میں عدالت سے رجوع کریں اور ایسا کرنے والوں کو قانون کے مطابق سزا دلوائیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کسی بھی ملک کے عام شہری کی عزت نفس اور حیثیت عرفی کو قانونی تحفظ حاصل ہے اور اسے مجروح کرنے والا قانون کی نظر میں مجرم تصور کیا جاتا ہے تو مذاہب کے پیشواؤں اور خاص طور پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے یہ حق کیوں تسلیم نہیں کیا جا رہا اور مذہب اور مذہبی راہنماؤں کی توہین و تحقیر کو رائے کی آزادی کے ساتھ تھی کر کے جرائم کی فہرست سے نکال کر حقوق کی فہرست میں کیسے شامل کیا جا رہا ہے؟

دوسرے مسئلہ پر پورا عالم اسلام متفق ہے اور دیگر مذاہب بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین و تحقیر سنگین ترین جرم ہے، اس لیے کہ اس میں مذہبی پیشواؤں کی توہین کے ساتھ ساتھ ان کے کروڑوں

پیروکاروں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور امن عامہ کو خطرے میں ڈالنے کے جرائم بھی شامل ہو جاتے ہیں جس سے اس جرم کی سنگینی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے اور قرآن و سنت، بائبل اور وید سمیت تمام مسلمہ مذہبی کتابوں میں اس کی سزا موت ہی بیان کی گئی ہے۔ کیونکہ اس سے کم سزا میں نہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے احترام کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے کروڑوں پیروکاروں کے مذہبی جذبات کی جائز حد تک تسکین ہو پاتی ہے۔

مگر جہاں تک تیسری بات ہے، اس پر توجہ کی ضرورت ہے کہ موت کی سزا کی اتھارٹی کس کو حاصل ہے؟ اس پر گفتگو اور مکالمہ کی گنجائش موجود ہے اور قانون کو ہاتھ میں لینے سے معاشرہ میں جس لاقانونیت اور افراتفری کو فروغ ملتا ہے، اس پر قابو پانے اور اسے روکنے کے لیے باہمی بحث و مباحثہ کے ساتھ تمام طبقات کو متفقہ رائے اور موقف اختیار کرنا چاہیے۔ جبکہ ہماری رائے میں قانون کو ہاتھ میں لینے اور از خود کاروائی کر ڈالنے کی بجائے قانون کا راستہ اختیار کرنے اور توہین و تحقیر کا سنگین جرم کرنے والوں سے قانون کے ذریعے نمٹنے کے طریقہ عمل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، کیونکہ اسی صورت میں ہم ان بہت سے مفاسد سے بچ سکتے ہیں جو اس بارے میں مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس لیے فرانس میں قتل عام کا ارتکاب کرنے والوں کے عمل کی مذمت کرنی چاہیے، مگر توہین و تحقیر کے عمل کو بھی اسی طرح سنگین جرم قرار دے کر اس کی مذمت کرنا ضروری ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم اس مسئلہ کے ایک اور پہلو کی طرف بھی توجہ دلانا چاہیں گے جو اس مسئلہ پر مغربی دنیا کی سیاسی اور مذہبی قیادت کے متضاد موقف کے باعث سامنے آ رہا ہے اور نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ حال ہی میں برطانیہ کے وزیر اعظم ڈیوڈ کیرون اور امریکی صدر بارک اوباما نے مشترکہ بیان میں گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کو رائے کی آزادی کے دائرہ میں شامل کیا ہے، اور اسے اپنا پسندیدہ حق قرار دیا ہے، جبکہ پاپائے روم نے کہا ہے کہ توہین اور مذہبی جذبات کی تحقیر کا آزادی رائے کے حق سے کوئی تعلق نہیں ہے، حتیٰ کہ انہوں نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص میری ماں کی توہین کرتا ہے تو اسے میری طرف سے مکا کھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں مغربی دنیا کا یہ فکری تضاد ہی اس مسئلہ کی اصل جڑ ہے کہ مذہب کے معاشرتی کردار سے انحراف کرنے والوں نے مذہب کے خلاف نفرت اور اس کی ہر حوالہ سے نفی اور توہین کو اپنا مشن بنا رکھا ہے، جبکہ خود مسیحی دنیا کی اعلیٰ ترین مذہبی قیادت بھی اس موقف کو قبول نہیں کر رہی۔

اس لیے ضرورت ہے کہ ارباب علم و دانش مغربی قیادت کے اس داخلی فکری تضاد کو واضح کریں اور مغربی لامذہبیت کی اس انتہا پسندی اور فکری دہشت گردی کو اجاگر کریں جو اس نے مذہب کے معاشرتی کردار کو دنیا سے ختم کر دینے کی مہم میں مسلسل ناکامی کے بعد جھنجھلاہٹ میں اختیار کر رکھی ہے اور جو اس بات کی علامت ہے کہ مغرب کی لامذہبیت انسانی معاشرہ میں اپنی پسپائی کو یقینی سمجھتے ہوئے اویچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے۔

بین المسالک، ہم آہنگی اور افہام و تفہیم

[بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ "اقبال مرکز بین الاقوامی ادارہ برائے تحقیق و مکالمہ" کے زیر

اہتمام 20-21 جنوری کو فیصل مسجد کے اقبال آڈیٹوریم میں ”بین المسالک ہم آہنگی اور افہام و تفہیم کی حکمت عملی“

کے عنوان پر منعقدہ دوروزہ قومی کانفرنس میں کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ [

بعد الحمد للہ! آج کی نشست کا عنوان ”ہم آہنگی کی حکمت عملی ماضی اور حال کے تجربات کی روشنی میں“ ہے اور اس میں اسی کے حوالہ سے کچھ معروضات پیش کروں گا۔ مجھے مسلکی کشمکش اور ہم آہنگی کے دونوں دائروں میں مصروف عمل ہونے کم و بیش پچاس سال ہو گئے ہیں اور بھگوانہ تعالیٰ کشمکش اور ہم آہنگی کے دونوں میں نصف صدی کا تجربہ رکھتا ہوں۔ اس سلسلہ میں تجربات و مشاہدات کا ایک وسیع تناظر ذہن میں ہے لیکن وقت کا دامن تنگ ہے اس لیے اصولی طور پر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ پاکستان میں ہم آہنگی اور کشمکش کے اسباب میں چار امور خصوصی توجہ کے طلب گار ہیں۔ ہمارا اجتماعی مزاج یہ بن گیا ہے کہ دو باتیں ہمارے درمیان اتحاد، ہم آہنگی اور رواداری کا سبب بنتی ہیں، اور دو باتیں انتشار و افتراق اور کشمکش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد کے تناظر میں بات کروں گا کہ جب بھی ہم نے کسی مشترکہ قومی یا دینی مسئلہ کے لیے جدوجہد کی ہے ہمارے درمیان ہم آہنگی کا ماحول پیدا ہوا ہے اور تمام مذہبی مکاتب فکر باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک بیج پر آگئے ہیں۔ قیام پاکستان کی جدوجہد، ختم نبوت کے تحفظ کی جدوجہد، ناموس رسالت کا تحفظ، تحریک نظام مصطفیٰ اور نفاذ اسلام کا محاذ جب بھی گرم ہوا ہے ہم متحد ہوئے ہیں اور مل جل کر ایک پلیٹ فارم پر ہم نے محنت کی ہے۔

پارلیمنٹ اور اسلامی نظریاتی کونسل ہو یا کسی عوامی تحریک کا فورم، مشترکہ دینی اور قومی مقاصد میں پاکستان کے مذہبی مکاتب فکر نے ہمیشہ متحد ہو کر قوم کی راہ نمائی کی ہے۔ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے جس کی ایک ہلکی سی مثال یہ ہے کہ ملک میں سودی نظام کے خاتمہ کی جدوجہد میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ اور جماعت اسلامی کے سنجیدہ راہ نما آج بھی ملی مجلس شرعی اور تحریک انسداد سود پاکستان کے فورم پر اکٹھے ہیں اور تھوڑی بہت محنت بھی ہو رہی ہے۔

مذہبی مکاتب فکر کے درمیان ہم آہنگی اور وحدت کا دوسرا سبب عام طور پر بیرونی دباؤ بنتا ہے۔ عالمی دباؤ ہو یا ملک کے اندر سیکولر حلقوں کی طرف سے اس قسم کی کوئی بات سامنے آئے تو ہم متحد ہو جاتے ہیں اور ہمارے مسلکی اختلافات مشترکہ جدوجہد میں رکاوٹ نہیں بن پاتے۔ مدارس کے خلاف دباؤ اور تحفظ ناموس رسالت کے قانون کے خلاف عالمی دباؤ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ مساجد و مدارس کو کوئی خطرہ لاحق ہو جائے یا ناموس رسالت سمیت کسی مسلمہ شرعی حکم کے خلاف عالمی لابیوں متحرک ہونے لگیں تو یہ دباؤ ہمارے درمیان اتحاد و ہم آہنگی کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یہ ہم آہنگی اسی وقت تک رہتی ہے جب تک دباؤ رہتا ہے۔ دباؤ کم ہوتے ہی ہم پھر اپنے اپنے بیج پر چلے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد دہانی کے طور پر ذکر کرنا چاہوں گا کہ ناموس رسالت کے قانون کے خلاف بین الاقوامی دباؤ کے ایک مرحلہ میں منصورہ لاہور میں مذہبی مکاتب فکر کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں تمام مکاتب فکر کی اعلیٰ قیادتیں شریک تھیں۔ اجتماع کے اختتام پر غالباً پاک پین شریف کے سجادہ نشین محترم نے شرکاء سے ایک چھینتا ہوا سوال کیا کہ آج اس اجتماع میں تمام مذہبی مکاتب فکر کے بڑے بڑے راہ نما جمع ہیں اور بہت اچھا منظر دیکھنے

میں آ رہا ہے، لیکن کیا اس طرح دوبارہ اکٹھا ہونے کے لیے ہم کسی اور بڑے حادثے کا انتظار کریں گے؟ اور کیا کسی سانحے اور حادثے کے بغیر ہم اس طرح جمع نہیں ہو سکتے؟ سچی بات ہے کہ اس سوال کی چھن میں آج تک اپنے دل میں برابر محسوس کر رہا ہوں، چنانچہ:

تجربہ اور مشاہدہ کے مطابق جس طرح مشترکہ قومی یا دینی مسئلہ کے لیے جدوجہد یا کسی دینی مسئلہ پر بیرونی دباؤ ہمارے درمیان ہم آہنگی کے دو بڑے سبب ہوتے ہیں اسی طرح ہمیں پھر سے منتشر کر دینے کے بڑے سبب بھی میرے خیال میں دو ہی ہیں۔ ایک یہ کہ جب مذہبی قیادتوں کا اتحاد اور مشترکہ جدوجہد زیادہ دیر چلتی نظر آئے لگتی ہے تو ہر مسلک اور مذہبی مکتب فکر کے مٹھی سطح کو اپنا اپنا مسلک خطرے میں محسوس ہونے لگ جاتا ہے اور مسلکی تشخص و امتیاز پس منظر میں جاتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے۔ چنانچہ اس سطح کے لوگ اپنے اپنے مسلک کے تحفظ کے لیے بڑی محنت کے ساتھ ایسا ماحول پیدا کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ بڑی قیادتیں ان کے سامنے بے بس ہو جانے میں ہی عافیت محسوس کرتی ہیں اور معاملات پھر پرانی ڈگر پر واپس جانا شروع ہو جاتے ہیں۔

انتشار و افتراق کا دوسرا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ دینی قیادتوں کا اتحاد جب کسی دینی مسئلہ پر ملک کے عمومی نظام میں کسی تبدیلی کا باعث بننا دکھائی دینے لگتا ہے تو ”اسٹیٹس کو“ کی محافظ قوتیں چونکنا ہو جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ وہ ریڈ لائن نمایاں ہونے لگتی ہے جو قیام پاکستان کے بعد سے مروجہ نظام کو ہر حالت میں باقی رکھنے کی خواہش مند قوتوں نے قائم کر رکھی ہے۔ اور وہ ”اسٹیٹس کو“ کی حفاظت میں اس قدر حساس ہیں کہ مروجہ نوآبادیاتی نظام میں کسی ہلکی سی تبدیلی کا امکان بھی انہیں بے چین کر دیتا ہے۔ پھر وہ قوتیں اپنے خفیہ وسائل و ذرائع کو حرکت میں لاتے ہیں اور دینی قیادتیں اپنی تمام تر صلاحیتوں اور کوششوں کے باوجود ”تاریخ پڑو“ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

کچھ عرصہ قبل لاہور کے فلیڈیئر ہوٹل میں متحدہ علماء کونسل کے زیر اہتمام سود کے مسئلہ پر منعقد ہونے والے سیمینار میں اکاؤنٹس کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے ایک ریٹائرڈ اعلیٰ افسر نے بتایا کہ ہم لوگ ایسے مواقع پر سرکردہ علماء کرام کی خدمت میں باقاعدہ حاضری دے کر اور انہیں ان کے مسلک کے ساتھ گہری ہمدردی اور وفاداری کا یقین دلا کر گزارنے بھی پیش کرتے تھے اور ایسے مسائل کی طرف انہیں توجہ دلاتے تھے جو مسلک کے درمیان خلفشار کا باعث بنتے ہیں۔ اور اسی طرح ہم قومی سطح پر دینی جماعتوں کے اتحاد کو سبوتاژ کر دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

اس پس منظر میں حکمت عملی کے حوالہ سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ بین المسالک ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے ہمیں دو امور پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینی چاہیے۔ ایک یہ کہ مشترکہ دینی اور قومی مسائل پر جدوجہد کو ترجیح دی جائے اور ملک و ملت کو درپیش مسائل میں قوم کی اجتماعی راہ نمائی کو فروغ دینے پر زیادہ سے زیادہ محنت کی جائے۔ دوسرا یہ کہ ہر مسلک کی اعلیٰ قیادتیں اپنی مٹھی سطح کے کارکنوں اور علماء کرام کی تربیت کا اہتمام کریں اور ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل و مشکلات کی اہمیت اور نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے انہیں اجتماعی جدوجہد، ملی مقاصد اور قومی ضروریات کے لیے محنت پر تیار کریں۔

دہشت گردی اور فوجی عدالتیں

دہشت گردی کے خلاف جنگ کو ”سانحہ پشاور“ نے ایک نیا رخ دے دیا ہے اور اس کے لیے قومی سطح پر اقدامات کو منظم کرنے کی طرف پیش رفت جاری ہے۔ اس حوالے سے گزشتہ ماہ اسلام آباد میں مولانا فضل الرحمن کی رہائش گاہ پر دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والی دینی و سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ ”مجلس علماء اسلام پاکستان“ کی سپریم کونسل کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس میں راقم الحروف بھی شریک تھا۔ اجلاس میں مولانا فضل الرحمن کی طرف سے دی گئی بریفنگ بہت معلوماتی اور فکر انگیز تھی جس کی روشنی میں سپریم کونسل نے اپنی حکمت عملی اور طریق کار کا تعین کیا ہے۔ اس میں یہ بات سرفہرست ہے کہ ہم دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے قومی یک جہتی کا حصہ ہیں، ملک کی دینی و سیاسی قیادت کے ساتھ کھڑے ہیں اور اس میں بھرپور کردار ادا کریں گے، مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ تحفظات کا اظہار بھی کیا گیا۔

مثال کے طور پر اس طرف توجہ دلائی گئی کہ امریکہ کے تھنک ٹینک رینڈ کارپوریشن نے سالہا سال قبل یہ کہا تھا کہ اس کے تجربہ کے مطابق مشرق وسطیٰ میں سلفی اور جنوبی ایشیا میں دیوبندی مسلک کے لوگ مذہبی انتہا پسندی کے علمبردار ہیں اور دینی مدارس اس کے مراکز اور سرچشمے ہیں۔ اور صرف رینڈ کارپوریشن نہیں بلکہ مغربی فلسفہ و ثقافت کی نمائندگی اور تحفظ کرنے والے دیگر بہت سے فکری ادارے بھی مغربی فلسفہ و تہذیب کے فروغ میں سامنے آنے والی رکاوٹوں میں انہی تین ناموں کا تذکرہ سب سے زیادہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ تجربہ زمینی حقائق اور معروضی صورت حال سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے؟ اس کی بحث ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن ان کے اس مسلسل پراپیگنڈے بلکہ وسیع تر لائبرنگ کے بعد جب پاکستان کے بعض دانش ور، میڈیا کے اینکرز اور مسلکی عصیت کے دائرے میں سیاست کرنے والے مذہبی راہ نمادہشت گردی کی اس جنگ میں دیوبندیت اور دینی مدارس کو ٹارگٹ کرنے کی بات کرتے ہیں تو رینڈ کارپوریشن اور دیگر مغربی اداروں کی رپورٹیں پھر سے ذہنوں میں تازہ ہو جاتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شایان رپورٹوں کی بنیاد پر قومی پالیسی کو مخصوص رخ دینے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ پر ابہام اور شکوک و شبہات کی ایک تہہ اور چڑھ جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر کسی بھی مسئلہ کے معروضی پس منظر اور منطقی نتائج پر حقیقت پسندانہ غور کرنے کی بجائے اس مسئلہ سے شخصی، گروہی اور طبقاتی مفادات حاصل کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے اور اس کا دائرہ صرف سیاست یا مذہب کی حد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ معاشرہ کی ہر سطح پر یہ بیماری ہماری رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ بالکل پختل سطح پر عام دیہاتی ماحول میں بھی اگر کوئی تنازعہ ہوتا ہے اور ہم قانونی کارروائی کے لیے ایف آئی آر درج کراتے ہیں تو ہماری ترجیحات میں یہ بات سرفہرست ہوتی ہے کہ اس کیس میں مخالفین میں سے کس کو پھنسا یا جا سکتا ہے، اور دوسری طرف سے اس مقدمہ کی پیروی کرنے والوں کو اس میں کیسے بانڈھا جا سکتا ہے۔ ملک کے کسی بھی حصہ میں تھانوں میں درج ہونے والی ایف آئی آر کا جائزہ لیا جائے تو ان میں نوے فی صد کے لگ بھگ رپورٹوں

میں یہی ذہنیت کارفرما دکھائی دے گی۔ یہی ذہنیت پھر مذہبی اور سیاسی تنازعات میں بھی ہر سطح پر ہمارے تنازعات اور معاملات کے لیے اولین ترجیح قرار پاتی ہے۔

ماضی میں اس سے قبل قائم ہونے والی فوجی عدالتوں اور احتسابی اداروں کے بارے میں ایک دوسرے سے یہی شکایت چلی آرہی ہے کہ انہیں ایک دوسرے کے خلاف سیاسی انتقام کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور بہت سے معاملات میں سے یہ شکایت صرف الزام کی حد تک محدود نہیں ہے۔ اس لیے دہشت گردی کی روک تھام کے لیے کیے جانے والے اقدامات بلا تفریق ہونے چاہئیں اور ان میں سے کسی مسلک، جماعت اور دینی یا سیاسی حلقے کے خلاف انتقامی کارروائی اور کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف جانبداری کا تاثر نہیں ملنا چاہیے۔ اگر ہمارے قومی، سیاسی اور عسکری راہ نمادہشت گردی کے خلاف جنگ کے اس فیصلہ کن مرحلہ پر اپنی مشترکہ پالیسی کے تعین میں ان تحفظات کو سامنے رکھ کر قومی اتفاق رائے کے ساتھ آگے بڑھ سکیں تو نہ صرف یہ کہ دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ مؤثر اور نتیجہ خیز ہوگی بلکہ قومی وحدت، یک جہتی، ہم آہنگی اور باہمی اعتماد میں بھی اضافہ ہوگا، جو آنے والے حالات میں پہلے سے کہیں زیادہ ہم سب کی مشترکہ ضرورت ہوگی۔

اس ضمن میں مدرسہ اور دہشت گردی کے حوالے سے دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ جن افراد یا گروہوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے، ان کی بڑی تعداد مدرسہ کی بجائے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم یافتہ ہے۔ عالمی سطح اور قومی سطح پر دہشت گردی کے عنوان سے معروف بیشتر شخصیات کا دینی مدرسہ کی بجائے کالج اور یونیورسٹی سے تعلق ہے، لیکن سارا نزلہ دینی مدرسہ پر گرایا جا رہا ہے۔ دینی مدارس کے بہت سے افراد مسلح تحریکوں میں شامل ہوئے ہیں مگر انہیں اس کی ٹریننگ مدرسہ نے نہیں دی، اور نہ ہی مدرسہ کے پاس اس کے وسائل اور اسباب موجود ہیں۔ یہ تلاش کیا جائے کہ ٹریننگ دینے والا کون ہے، اور مسلح تحریکوں میں شریک ہونے والوں میں دوسرے تعلیمی اداروں کے افراد کا تناسب کیا ہے۔

ہمارے خیال میں دینی حلقوں کو دہشت گردی کے اسباب کے تعین کے لیے اعلیٰ سطحی قومی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کرنا چاہیے جو دہشت گردی کی تعریف واضح کرے، جہاد، تحریک آزادی اور دہشت گردی کی حدود متعین کرے، اور اس کے سدباب کے لیے تجاویز اور سفارشات مرتب کرے۔ اگر حکومت ایسا نہیں کرتی تو سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ ججوں، ریٹائرڈ جرنیلوں، دینی مدارس کے ذمہ دار نمائندوں اور ممتاز وکلاء پر مشتمل ایک پرائیویٹ کمیشن بھی قائم کیا جا سکتا ہے جو اس خلا کو پر کرے اور قوم کو اس کنفیوژن سے نکالے۔ اس کے بغیر دہشت گردی کے خلاف کی جانے والی کوئی بھی کارروائی شکوک و شبہات اور تحفظات و اعتراضات سے پاک نہیں ہوگی۔

دوسری بات یہ کہ خود حکومت پاکستان نے اب تک باسٹھ گروہوں کو دہشت گرد قرار دے کر ان پر پابندی لگا رکھی ہے۔ ان باسٹھ تنظیموں کی فہرست قومی پولیس کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ ان میں مذہب کے نام پر دہشت گردی کے مرتکب گروہ بھی شامل ہیں، لسانیت اور قومیت کے عنوان سے مسلح کارروائیاں کرنے والے گروہ بھی موجود ہیں، اور

دولت کے لیے ریغال بنا کر دہشت پھیلانے والوں اور قتل و غارت کرنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ان میں سے صرف مذہبی افراد کو فوجی عدالت میں پیش کرنا اور باقی سب گروہوں کو اس دائرے سے خارج کر دینا نہ صرف یہ کہ نا انصافی ہے بلکہ قومیت، لسانیت، لوٹ مار اور دیگر مقاصد کے لیے دہشت گردی کرنے والوں کو کھلی چھٹی اور جواز فراہم کر دینے کے مترادف ہے۔ اس پر ہر محبت وطن شخص کو آواز اٹھانی چاہیے اور اسے روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حضرت مولانا محمد نافع رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال

گزشتہ ماہ کے دوران ایک غمناک خبر نے سب کو رنجیدہ کر دیا کہ استاذ محترم حضرت مولانا محمد نافع کا انتقال ہو گیا ہے، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ علمی دنیا انہیں اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی ترجمان اور صحابہ کرامؓ کے ناموس و وقار کے تحفظ کی علامت کے طور پر جانتی ہے۔ وہ امام اہل السنۃ حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کے اس علمی قافلہ کے ایک فرد تھے جنہوں نے اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کے فروغ و تحفظ اور حضرات صحابہ کرامؓ و اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم کی حیات و خدمات کی اشاعت اور ان کے بارے میں معاندین کی طرف سے مختلف ادوار میں پھیلانے جانے والے اعتراضات اور شکوک و شبہات کے جواب و دفاع میں مسلسل جدوجہد کی ہے۔ ان میں حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ، حضرت علامہ دوست محمد قریشیؒ، حضرت مولانا قائم الدین عباسیؒ، حضرت مولانا عبدالرحمن جام پوریؒ، اور حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں، جبکہ اس قافلہ کے غالباً آخری فرد حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود دامت برکاتہم کچھ عرصہ سے علیل اور صاحب فراش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور حضرت علامہ صاحب کو صحت کاملہ و عاجلہ سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

حضرت مولانا محمد نافع جھنگویؒ والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کے دورہ حدیث کے ساتھیوں میں سے تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے۔ میرا ان سے استفادہ کا تعلق تو طالب علمی کے دور سے تھا کہ ان کی بہت سی تصانیف بالخصوص ”رحماء بینہم“ اور حضرت علامہ خالد محمود مدظلہ کے متنوع مضامین کا مجموعہ ”عقیقات“ اس قسم کے مسائل میں میرے لیے راہ نمائی کا سب سے بڑا ذریعہ چلے آ رہے ہیں، مگر ایک بار مولانا مفتی محمد جمیل خان شہید کی معیت میں چینوٹ کے چند علماء کرام کے ساتھ جامعہ محمدی شریف میں حضرت مولانا محمد نافع کی خدمت میں حاضری دی تو ان سے تلمذ کا شرف اور ان کی سند کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت کی سعادت بھی ہم لوگوں نے حاصل کی۔ وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملتا رہتا تھا۔ وہ شفقتوں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ اپنی کسی تازہ تصنیف سے بھی نوازتے تھے، اور کوئی نہ کوئی مسئلہ یا حوالہ بھی ان سے مل جایا کرتا تھا۔

ایسے بزرگوں کی وفات پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”یرفع اللہ العلم بقبض العلماء“ کی عملی تصویر تو ذہن میں پھر سے تازہ ہو جاتی ہے، مگر اس خلا کو مسلسل بڑھتے دیکھ کر دل ڈوبنے لگتا ہے۔ مشیت ایزدی کے سامنے کیا چارہ ہے، اللہ تعالیٰ حضرت استاذ محترم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور ان کے تلامذہ و متوسلین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کی حسنت کا سلسلہ تادیر جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔